OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

ملتان کی تاریخی، تہذیبی و ثقافتی عکاسی: سرائیکی ناول "بیڑی وچ دریا"

The Historical, Civilized, and Cultural Reflection of Multan: The Saraiki Novel "*Beri Wich Darya*"

Dr Rubina Shehnaz
Lecturer Saraiki, Govt. Associate College (W) Yazmaan
Dr Ayaz Ahmad Rind
Department of Saraiki Ghazi University, D.G Khan
Mahar Mushtaq Ahmad
Visiting Lecturer, Department of Saraiki, Ghazi University, Dera Ghazi Khan

Abstract

Saraiki Novel"بیڑی وچ دریا"(River in a Boat) which has come out to highlight the history, Civilization and Culture of Multan. This Novel is authored by Dr. Aslam Ansari, it is a journey of both body and Soul. The title of the novel also indicates that the tree is a metaphor for the heart and the river is the emotions, feelings and thoughts, contained in it. Characterization, Scenes, Dialogues, Emotions and details in the novel are of high quality. The author's grip on the plot seems very strong. His artistic and intellectual qualities are Saraiki.Dr. Aslam Ansari's novel "River in a Boat" has made a conscious effort to preserve the centuries-long history of Multan. So, he has to risk his life. Sanwal has to Travel to Delhi and Ajmer to fulfill his promise to rescue Heer Dikhan Vasu from the

CC BY

mire of sin. Sher Khan, a representative of the class, forcibly picks her up and marries her. But the same Sher Khan is killed by his nephews; references to the play are an important part of the novel. Sanwal is deeply saddened when sarang is killed in a battle with the British. There is a time that even after finding love the grief of the death of his friend Sarang due to the British occupation, the pain of injustice forces Sanwal to throws himself in to the river. The plot of the "River in the Boat" is fast and beautifully decorated. The language of the novel is convoluted and confused. The Style is charming and reminiscent of the general tone of ancient Times. The Scenes of urban life are good, while the rural scenes have a sense of thirst. In the first part of the novel, an attempt has been made two draw a map of 150 years old Multan.Sarang's innocence is proved due to Sanwal testimony during the moul Raj brutal treatment of the residents of Multan in 1888 has been made clear. Later, the account of British captured Multan.

Key Words: "River in the Boat", History, Civilization and Culture of Multan, Highlighted in Dr: Aslam Ansari's Novel

تمہید

ڈاکٹر اسلم انصاری سرائیکی نثر نگاری کا ایک نمایاں نام ہے جن کی ملتان کے علمی و ادبی حوالے میں ایک خاص پہچان ہے ان کی بیشتر تخلیقات ہمیں انگریزی اردو اور سرائیکی میں ملتی ہیں ان کا ادبی لب ولہجہ انہیں اس دھرتی کے بڑے نثر نگاروں میں شمار کرتا ہے انہوں نے اس دھرتی کی قدیم زبان سرائیکی کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا اور یہاں کی مقامی زبان سرائیکی میں ناول نگاری کر کے اس وسیب کے باسی ہونے کا حق ادا کیا۔ ان کا سرائیکی ناول "بیڑی وچ دریا" ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا اور سرائیکی ناول نگاری میں اہم ترین ناول قرار دیا گیا۔ اس کے معیار کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے ایم اے سرائیکی کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ اس ناول میں ملتان کے تمدن اس کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے اور سرائیکی زبان کے قدیم لفظوں کو نئی جہت سے پیش کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ جس کے بارے میں ناول نگار خود لکھتے ہیں:

" ڈٹھا ونجے تاں ملتان اپنْی تہذیب و معاشرت دے قدیم ہوونْ دے باوجود کہیں مناسب حد تئیں وڈی کہانْی (A Story of Certain Magnitude) دا موضوع نیں بنْ سگیا۔"[1]

موضوع پر بحث

ادب ارد گرد کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے سماج میں جو ہوتا ہے وہی ادب کا حصہ بنتا ہے ادیب حساس ہوتا ہے وہ ارد گرد کے ماحول کو اور اس سے جُڑے مسائل کو محسوس کرتا ہے اور انہیں ادب میں سمو دیتا ہے۔بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جو ارد گرد کے ماحول اور سماج کی بات کرتا ہے جس میں وہ رہتا ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے جس کے لینڈ سکیپ سے وہ محسور ہوتا ہے جس کے مسائل سے وہ بخوبی واقف ہوتا ہے اور ڈاکٹر اسلم انصاری نے بھی اپنے ناول میں اس قدیم دور کے مسائل ،ماحول اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کو بیان کرنے کی بہترین کوشش کی ہے جن کے بارے میں سرائیکی کے مشہور دانشور ڈاکٹر اسلم عزیز درانی لکھتے ہیں:

" اسلم انصاری دے ناول "بیڑی وچ دریا" دا تانا پیٹا سرائیکی ماحول تے وسیب دے ارد گرد ونڑیا گئے۔ ایندے وچ شہری تے دیہاتی زندگی دے مناظر تے کردار موجود ہن۔"[2]

تاریخ انسانی شعور کو اجاگر کرتی ہے اور تاریخ سے ہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ قدیم دور میں انسان کتنی باشعور رہا ہے اس کا رہن سہن اس کا معاشی نظام اس کا سماجی نظام اس کا تہذیب و تمدن کیسا رہا ہے۔ تاریخ سے ہی پتہ چلتا ہے کہ انسان کے ثقافتی و تہذیبی ورثے کیا ہیں۔ڈاکٹر اسلم انصاری کا یہ ناول بھی ایک تاریخی حوالہ سے اپنی مثال آپ ہے اس میں سرائیکی وسیب کے قدیم خطے ملتان کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول "بیڑی وچ دریا" میں ملتان کی قدیم تاریخ کو محفوظ کرنے کی شعوری کوشش کی گئی ہے۔اس ناول میں ملتان کے قدیم لینڈ سکیپ اور منظر نامے کے بارے میں سرائیکی کی پروفیسر ڈاکٹر نسیم اختر لکھتی ہیں کہ:

"عنوان "بیڑی وچ دریا" وڈا ہی سمبالک ہے۔ اگرچہ ایندے وچ ڈسیا گئے۔ جو قیمتی موتی سارنگ دے کول ہئی۔ ایندے ہک پاسے لگدے جو بیڑی بنْی ہوئی ہے تے ڈوجھی پاسوں دریا ٹھٹھیں مریندا اپئے۔ پر میں اینکوں ظاہری عنوان آکھساں کیوں جو میں سمجھدی ہاں جو "بیڑی" سانول دا دل ہے تے اوندے اندر دریا ہے۔ جیکوں پورے ناول وچ واہنداڈ کھایا گئے۔ ملتان دی تاریخ و تہذیب و تمدن دا دریا جیڑھا کہیں زمانے وچ موجزن ہئی۔ اج ہک تاریخ ہے تے تاریخ و تمدن دی جیڑھی کشتی "بیڑی" بہوں سارا اثاثہ گھن کجھ کتاباں وچ "ٹھِل" گئی ہے۔ کیوں جو ایں ناول وچ زبان دے علاوہ سوہنْی چیز تاریخ ملتان ہے۔"[3]

ڈاکٹر حمید الفت ملغانی کی بھی اس ناول کے بارے میں یہی رائے ہے ان کے مطابق ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول "بیڑی وچ دریا" میں سرائیکی وسیب کے تاریخی خطے ملتان کی صدیوں پر محیط تاریخ کو محفوظ کرنے کی عمدہ کوشش کی گئی ہے۔ ناول میں ہیرو کا کردار انتہائی مضبوط کردار ہے۔ ناول کا ہیرو "سانول" دریا کے کنارے آباد ہوتے ہوئے اپنے دوست اور ملتان کے باسی سارنگ

کے لیے جان کی بازی لگا دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ ناول کی ہیروئن وسو کو گناہ کی دلدل سے نکالنے کی حامی بھرنے کے بعد قول نبھانے کے لیے سانول کی دلی اور اجمیر کا سفر کرنا پڑا ہے۔ معین الدین قریشی کے مزار پر مجاور بن کر شب و روز بسر کرنے کے بعد ملتان کا رخ کرتا ہے۔ جہاں استحصالی طبقے کا نمائندہ شیر خان وسو کو زبردستی اٹھالیتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے۔ لیکن یہی شیر خان اپنے بھتیجوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ ملتان کی بدحالی اینٹ سے اینٹ بجانے کے تذکرے ناول کا اہم حصہ ہیں۔ انگریزوں سے ہونے والی لڑائی میں سارنگ کے مارئے جانے پر سانول بہت غمگین ہوتا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اپنی محبت کے باوجود بھی دوست کی موت کا غم اور دھرتی پر انگریزوں کے قبضے کے حوالے سے وسیب میں ہونے والی ناانصافی کا دکھ سانول کو دریا میں کود جانے پر مجبور کرتا ہے۔ ناول کے پلاٹ، منظر نگاری، تاریخ حوالے اور اسلوب کے بارے میں ڈاکٹر حمید الفت ملغانی لکھتے ہیں:

> " بیڑی وچ دریا" کا پلاٹ چست اور حسن ترتیب سے مزین ہے۔ ناول کی زبان منجھی ہوئی اور سلجھی ہوئی ہے۔ انداز بیان، دلکش اور قدیم زمانے کے عمومی لہجے کا ترجمان ہے۔ شہری زندگی کے مناظر خوب ہیں۔ جب کہ دیہی مناظر میں کہیں کہیں تشنگی کا احساس پایا جاتا ہے۔ ناول کے پہلے حصے میں ڈیڑھ سو سال قدیم ملتان کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔"[4]

ناول کی کہانی اور کردار نگاری کی بات کی جائے تو اس ناول کے اہم کرداروں میں سانول بڈھا جھبیل، جان بی بی، سارنگ، صاحباں، فیضاں، وسو، کنیزاں، حاکم بی بی، پیر بخش، نادر اور نرملا شامل ہیں۔ سانول دریائی علاقے کا ایک جوان ہے۔ جس کا دوست سارنگ ہے جسے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے بچانے کے لیے سانول طوفانی رات میں دریا پار کرتا ہے۔ اس دوران اسے بہت ساری مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کوئی بھی کشتی کا ملاح سانول کو دریا پار پہنچانے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ پھر ایک بوڑھا جو مہانہ جس کی کشتی میں سوراخ ہے وہ سانول کی دریا عبور کرنے میں مدد کرتا ہے۔ وہ سانول کو شہر کی طرف لے جاتا ہے اور پھر اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ جب سانول کا شہر کی طرف سفر شروع ہوتا ہے تو وہ سارنگ کے نوکر خدا بخش کے ذریعے سارنگ کی والدہ جان بی بی اور بہن کو ملتا ہے ان کے ذریعے اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دوست سارنگ وہاں کے حاکم کروڑی مل کے قتل میں پھنس چکا ہے اور صرف سانول ہی اس کی مدد کر سکتا ہے۔ سانول سارنگ کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ فیضاں اور وسو کو گواہی کے لیے تیار کرتا ہے اور بالآخر سارنگ کو بچالیتا ہے۔ سانول سفر کرتے ہوئے اجمیر شریف جا پہنچتا ہے۔ جہاں اسے اس کے پرانے وقت کی پسندیدہ طوائف وسو ملتی ہے۔ جس کی شادی سمیر خان سے ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اس کو حاصل نہیں ہوتی اور اس کا سفر ضائع ہو جاتا ہے۔ سانول ایک سوداگر آغا خان کے ذریعے دہلی آتا ہے۔ جہاں اسے اس کے باپ کا گھوڑ اپہچان لیتا ہے اور اس کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ آغا خان ہی وہ انسان ہے جس نے اس کے باپ سے دغا کیا تھا اور کنیزہ جو کہ کسی زمانے میں وسو کی نوکرانی تھی وہ سکھوں کے قبضے میں ہے۔ سانول کنیزاں کو وہاں سے بھگا کر ایک قافلے کے ذریعے قاضیوں کی بستی میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں ایک بوڑھا جھبیل ان کا نکاح کرا دیتا ہے وہ ملتان روانہ ہو جاتے ہیں اور راستے میں انہیں

معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے ملتان پر چڑھائی کر دی ہے۔ پھر وہ ملتان پہنچ کر سارنگ کے گھر آ جاتے ہیں اور سارے مل کر ایک خاندان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

ملتان کے بگڑتے حالات کو مد نظر رکھ کے سارنگ اور سانول انگریزوں کے خلاف لڑنے کا ارادہ کر لیتے ہیں۔ قلعے کا بارود خانہ پھٹنے سے سارنگ موقع پر مر جاتا ہے اور پھر اس کی ماں بھی اس کے غم میں مر جاتی ہے محلے والے صاحباں کی شادی سانول سے کرا دیتے ہیں۔ اللہ انہیں اولاد جیسی نعمت سے نواز دیتا ہے۔ وسو آخر میں درویش صفت لوگوں سے مل کر درویشی اختیار کر لیتی ہے۔ کہانی کے انجام میں سانول خودکشی کر لیتا ہے۔ اس ناول کی کہانی کو بہت خوبصورتی سے بُنا گیا ہے اور ماحول نگاری بھی تخلیق کار کے اعلیٰ فن کو اُجاگر کرتی ہے جو کہ ناول کی خوبصورتی اور معنویت میں مزید اضافہ اضافے کا باعث نظر آتی ہے۔ ناول کی ماحول نگاری کو ناول کے اس اقتباس میں دیکھیں:

> "حویلی نما مکان آپنڑے وڈے ڈوطاقے دروازے تے اوندے نقش و نگار دی بدولت آپنڑے وسیکاں دی خوشحالی دا ثبوت ہئی۔ مکان تریہہ چالھی سال ضرور پڑانا ہوسی۔ شہر اندر دے دڈو جھیاں عمارتاں، انہاں دے چوبی چھجیاں تے پرانڑے ڈو منزلہ طرز تعمیر دے مقابلے وچ ذرا نویں انداز دا ہئی۔ اینکوں بعض لوک فیضاں دا بنگلی یا دروغے دی حویلی وی آدھے ہن۔ اصل وچ اے گھر فیضاں دی ماء تے جیڑھی نواب مظفر خان دے ویلے دی گوائن ہئی۔ آپنڑے زمانے وچ بنڑوایا ہئی۔ پر اے مشہور فیضاں دے ناں نال تھیائے۔"[5]

کہا جاتا ہے کہ موسیقی روح کی غذا ہوتی ہے اور موسیقی نے ہر دور میں انسان کو مسخر کیا ہے موجودہ دور میں تو انسان نے اپنے لئے بے شمار ایجادات کر لین ہیں جن سے وہ اپنی دماغی اور نفسیاتی تسخیر کر سکتا ہے مگر قدیم دور میں موسیقی ہی ایک ایسا آلہ تھی جس کے ذریعے انسان اپنے آپ کو انٹرٹین کرتا تھا اس کیلئے بڑی بڑی محافل سجائی جاتی تھیں اور رقاصائوں کا ایک مخصوص طبقہ تھا جو ان محافل کی شان بنا کرتی تھیں اور رقص اور آواز کا جادو جگا کر لوگوں کے دل موہ لیتی تھیں یہ رقص و سرور کی محفلیں آج بھی ہیں اور طوائفیں آج بھی ہیں مگر ان کیلئے اب فنکار کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے قدیم دور میں اس طرح کے کرداروں کو مختلف نام دیے جاتے تھے مرد کرداروں کو انٹ یا بھنڈ کہا جاتا تھا اور عورتوں کو رقاصائیں، طوائفیں یا کوٹھے والیاں کہا جاتا تھا۔ یہ طوائفیں نافقط رقص کرتی تھیں بلکہ اپنی مدھر آواز کا جادو بھی جگاتی تھیں یہ کلچر برصغیر کے تمام بڑے شہروں میں عام تھا اور ملتان بھی اس دور کا بڑا شہر تھا کہا جاتا ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے صرف ملتان میں ناٹک کی 13 کمپنیاں موجود تھی جن میں کئی نٹ اور بھنڈ کام کرتے تھے اور اس سے اپنی روزی روٹی کماتے تھے اور اسی طرح اس شہر میں طوائفوں کے کئی کوٹھے بھی موجود تھے جن میں رقص کے ساتھ ساتھ آواز کا جادو بھی جگایا جاتا تھا جن کا تذکرہ اس ناول میں ناول نگار نے کچھ اس طرح سے کیا ہے:

> "وسو ہیں کوٹھے وچ خاص خاص ویلے آپنڑی جوانی دی آواز جگیندی ہئی۔ جیں سارے شہر تے جادو کیتا ہویا ہئی۔ ایں ویلے او آپنڑے رنگیل پاویاں والے پلنگ تے براجمان ہئی۔ رنگلیل پلنگ دے نال ہک رنگیل

کرسی نما پیڑھی وی پئی ہئی۔ فرش تے دری وچھی ہوئی ہئی تے مہماناں دے آونڑ دے ویلے ایندے اُتے چِٹی چاِدریں وچھاِڈتی ویندی ہئی۔ ایں وڈے کمرے نال جڑے ہوئے ڈو ترائے بئے کمرے وی ہن۔ جنہاں وچ قیمتی سمان نال بھرے وڈے وڈے صندوق پرانْے پلنگ تے گھر دا اڈو جھا سمان تے شئے وست بھری راہندی ہئی۔ جنہاں وچوں ہک خاص فیضاں دا آپنْا تے ہک وسو دا ذاتی کوٹھا ہئی۔ جیڑھے طرحاں طرحاں دی آرائشاں نال بھرے ہوئے ہن۔ پر انہاں کوٹھیاں دے اندر زیادہ راہونْ نال ہاں منجھیجنْ لگ ویندا ہئی۔ البتہ وچلا وڈا کوٹھا، جتھاں خاص مہماناں کیتے گانوناں تھیندا ہئی۔ چنگا خوبصورت تے خوش نما ہئی۔ اتھائیں بہہ کے اٹھاراں انوی سالاں دی وسو شہر دے رئیساں، تماش بیناں تے اہل دل دے دلاں تے راج کریندی پئی ہئی۔"[6]

اسی طرح منظر نگاری کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ منظر نگاری ہی کسی کہانی کو باہم عروج تک پہنچاتی ہے خاص طور پر منظر نگاری کیلئے خوبصورتوں لفظوں کا استعمال کہانی میں مزید چار چاند لگا دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول میں بھی خوبصورت منظر نگاری پیش کرنے کیلئے خوبصورت لفظوں کا چُناٶ کیا گیا ہے اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

'رات اندھار غبار ہئی۔ جھڑ مینہہ دی کنْ منْ شروع تھی گئی ہئی۔ مہانْیں دی وستی لنگھدیں کرنیں، مینہ تیز تھی گیا ہئی۔ پتنْ تئیں پجدیں پجدیں اندھارا گھٹاٹوپ ہئی تے بدلاں دی کڑکاٹ کن ڈورے کریندی ہئی۔ پتنْ تے بیڑیاں دریا دی بھرتے لائیاں تے اکاں ہن تے کنڈے دار جھاڑیاں ہن۔ پر میڈ ابیڑی تے مہانْیں تئیں پُجنْا ضرور ہئی۔"[7]

اس ناول میں موجود خوبصورت منظر نگاری اور خوبصورت لفظوں کی ایک اور مثال ملاحظے کیجئے:

بڈھے جھبیل دی آواز، دریا تے ہوا دا شور تے چکر کھاندی ہر شئے تئیں رل کے ہک عجیب جیہاں سماں پیدا کرڈتا ہئی۔ دنیا ساری بھوندی پئی ہئی تے نویاں نویاں آوازاں تے شکلاں، چکر کھاندیاں چیزاں رل رُل کے ہک بھوندا جہان بن گیاں ہن۔ اینویں لگیا ہئی۔ جیویں چندا، سیجھ تے تارے وی ایں چار چھپیری گھمر گھیری وچ رل گین۔ "[8]

جذبات نگاری کسی تحریر کی جان ہوتی ہے جو کہانی کے انداز بیاں کو پختہ کرتی ہے اس ناول میں خوبصورت منظر نگاری کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے اس طرح محسوس ہوتا ہے جیسے آزاد شاعری کی گئی ہو جس کی ایک مثال دیکھیں:

"میندھی تے مندھریاں تے چھلیاں تے کنگڑاں تے جسلمیر دے نفیس چوڑے دی انہاں ہتھاں تے گسنیاں کوں کیا ضرورت ہئی۔ انہاں کیتے تاں پھلاں دے ڈوڈو گجرے ای بہوں ہن۔"[9]

کسی بھی زبان کی قدر و قیمت اس زبان میں موجود، محاورے اور کہاوتوں کے ذریعے متعین کی جاسکتی ہے ایک زبان امیر کبیر اس وقت بنتی جب اس کا ذخیرہ الفاظ بہت زیادہ ہو اور اس میں محاورے، کہاوتیں اور مقولے بہت ہوں جو کہ زبان کی خوبصورتی میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ محاوروں کا استعمال کسی بھی لکھت کو دلچسپ اور خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ زبان کی قدامات

اور دناوت کو بھی بیان کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسلم انصاری کے ناول، بیڑی وِچ دریا، میں بھی بہت سے ایسے محاورے استعمال کیے گئے ہیں جو ناول کے اسلوب کو خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان کی وسعت کو بھی بڑھا رہے ہیں اور اس میں چاشنی پیدا کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے ناول میں مثال کے طور پر کچھ کہاوتیں اور محاورے ملاحظہ کریں:

۱۔ وڈیاں بڈھیاں، مساتیں تے ملیریں، ماسیاں تے بوئیاں تے ہٹن دے چٹن کیتے جو میں کتھائیں پر نج پوواں پر میں آکھیا جو ہک نہیں تے سو سُکھ۔[10]

۲۔ پر حالی وی کڑانویاں وچ ٹھڈی چھانھ دی ہیل آویندی ہئ[11].

۳۔ اساں ہیسے تاں چڑھدی کنی دے یار[12]

۴۔ پر اے جیڑھا پھر دی دا پھیر پیا اے تاں میں خواب اچ ای نہ سوچیا ہئی۔[13]

۵۔ چوراں تے مورتاں پوندے ای راہندن، نادر دلیل کیتی۔[14]

۶۔ تیڈے نال ای کھیسی ضرور، اکھے جنہاں روائے یار انہاں کدی نہ بھلی وار[15]

خلاصۂ بحث

مذکورہ بالا تمام اقتباسات کی روشنی میں مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول "بیڑی وچ دریا" اس بات کی واضح شہادت ہے کہ ملتان وادی سندھ کا قدیم شہر ہے جو آج بھی اپنی مکمل آب و تاب کے ساتھ زندہ جاوید ہے جس کا تاریخی حوالہ اس کی تہذیب اور ثقافت کی جھلک دکھاتا ہے اس شہر میں کئی رنگ ابھر کر نمایاں ہوئے ہیں اور کئی رنگ بے رنگ ہوئے ہیں۔ اس شہر کی کئی پوشیدہ کہانیاں ہیں جن کی پرتیں کھولی جائیں تو ہمیں کئی تہذیبی و ثقافتی ورثے ملیں گے جن کی حفاظت نہیں کی گئی جو کہ جدت کی آڑ میں معدوم ہو گئے ہیں۔ کچھ تو اس شہر کی رنگینیوں کو حملہ آوروں کی نظروں نے اپنی نذر کر دیں اور کچھ ورثے جدت کی آڑ میں ہم خود گنوا بیٹھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ملتان اس وسیب کی پرانی تہذیب و ثقافت کی خوبصورت تصویر ہے۔ اور اس تصویر کو ناول نگار ڈاکٹر اسلم انصاری نے بہت خوبصورتی سے اپنے ناول، بیڑی وِچ دریا، میں نقش کر دیا ہے جسے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سرائیکی وسیب کتنی بڑی تہذیب و ثقافت کا امین ہے۔

حوالہ جات

1 اسلم انصاری، ڈاکٹر، "بیڑی وچ دریا"، ملتان، لوک ریت پبلیکشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۔

2 اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، سرائیکی ناول نگاری، ملتان، سرائیکی ادبی بورڈ، ۲۰۰۸ئ، س ۱۶۴۔

3 نسیم اختر، ڈاکٹر، "بیڑی وچ دریا"، مشمولہ، پیلوں، شمارہ نمبر ۲۲، مئی تا اگست ۲۰۰۸ئ، س ۲۸۴، ۲۸۵۔

4 حمید اللہ، الفت ملغانی، ڈاکٹر، سرائیکی افسانوی ادب، کراچی، رنگ ادب پبلی کیشنز، فروری ۲۰۲۱ئ، ص ۲۴۸، ۲۴۹۔

5 اسلم انصاری، ڈاکٹر، "بیڑی وچ دریا"، ملتان، لوک ریت پبلیکشنز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۔

6 ایضاً، ص: ۴۱۔

7 ایضاً، ص: ۱۷۔

8 ایضاً، ص: ۲۳۔

[9] ایضاً، ص:۸۱۔
[10] ایضاً، ص:۷۱۔
[11] ایضاً، ص:۴۴۔
[12] ایضاً، ص:۷۹۔
[13] ایضاً، ص:۷۹۔
[14] ایضاً، ص:۱۰۳۔
[15] ایضاً، ص:۱۰۳۔